Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اماں بھی گناہ کرتی ہیں؟"

"مجھ سے کم ہی کرتی ہوں گی؟"

"وہ تو بڑی لمبی دُعا مانگتی ہیں۔"

"ان کی عادت ہے۔"

"دعا مانگنے کی عادت اچھی ہوتی ہے؟"

شیخ عمر دراز کچھ دیر چُپ رہے، پھر سست لہجے میں بولے "اچھی ہی ہوتی ہے۔"

"آپ صرف معافی مانگتے ہیں؟" بچے نے باتیں جاری رکھیں۔

"ہاں۔"

"اماں کیا مانگتی ہیں؟"

"ان سے جا کر پوچھو۔" شیخ عمر دراز اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

"تم تو بڑی جرح کرتے ہو یار۔ بڑے ہو کر وکیل بنو گے؟"

اس پر بچے کا ذہن کسی اور طرف کو نکل گیا۔ بڑا ہو کر وہ کیا بنے گا؟

"بابا،" اُس نے پُوچھا، "آپ بمبئی بھاگ گئے تھے؟"

"کب؟" شیخ عمر دراز نے چونک کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔

"جب آپ چھوٹے تھے تو بمبئی بھاگ گئے تھے۔" آفتاب فاتحانہ انداز میں بولا، "مجھے اماں نے بتایا تھا۔"

کچھ دیر کے بعد شیخ عمر دراز کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ہاں۔" وہ بولے۔

"آپ اُس وقت چھوٹے تھے؟" آفتاب نے پُوچھا۔

"میں اُس وقت جوان تھا۔"

"جوان کتنے سال کا ہوتا ہے؟"

"بیس بائیس کا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اور نوجوان ؟"

"اٹھارہ بیس سال کا۔"

"بیس سال کا جوان ہوتا ہے یا نوجوان ؟"

"تم ضرور وکیل بنو گے۔" شیخ عمر درانہ نے دوبارہ مسکرا کر کہا۔

"آپ ایکٹر بننے گئے تھے ؟"

پہلی بار شیخ عمر دراز کا رنگ ہلکا سا بدلا، گویا ان کے بیٹے نے اُس مہین سی ان دیکھی، مگر سُنسان جھلّی میں ایک چھید کر دیا ہو جس کے اُس طرف وہ رہتے تھے۔ مگر یہ رنگ پریشانی کا رنگ نہ تھا، بلکہ اس رنگ میں کسی ایسے دُور کے جذبے کی جھلک تھی جو اچانک قریب آگیا ہو۔ بچّے نے اپنی بات کا جواب نہ پا کر باپ کی جانب منہ اُٹھایا مگر آسمان کی آہنی چمک نے اُس کی نظر پھیر دی۔

"اماں نے مجھے بتایا تھا۔" اُس نے کہا، "آپ ایکٹر بننے گئے تھے ؟"

"ہاں۔"

"کیسے ؟"

"ایک فلم میں کام کیا تھا۔"

"فلم یہاں آئی تھی ؟"

"اونہوں۔ اُس وقت صرف دو چار بڑے بڑے شہروں میں سینما ہوتا تھا۔"

"کیا کام کیا تھا ؟"

"سپاہی بنا تھا۔"

"پولس کا ؟"

"نہیں فوج کا۔"

"آپ کی جنگ ہوئی تھی ؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بہت بڑی جنگ ہوئی تھی۔ انگریزوں اور مسلمانوں کی۔"

"کہاں پر؟"

"پہاڑیوں پر اور ریگستانوں میں۔۔۔۔"

"ریگستان میں پہاڑیاں ہوتی ہیں؟"

"کئی ریگستانوں میں ہوتی ہیں۔ لڑائی کے لیے ایسا علاقہ بہترین ہوتا ہے۔ میرے پاس سفید گھوڑا تھا۔"

آفتاب نے محسوس کیا کہ اُس کا باپ اب محض اُس کی باتوں کا جواب دینے کی بجائے اپنی باتیں کرنے لگا تھا۔ اس کا دل خوشی سے پھول اُٹھا آسمان کی تیزی کی وجہ سے وہ نظر اُٹھا کر اپنے باپ کی طرف نہ دیکھ سکتا تھا، مگر اُسے احساس تھا کہ اُس کا باپ بھی اس کی طرح خوش ہے۔ اُسے یہ بھی پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ اس کا باپ کس کی طرف تھا۔ اس کے دل میں یقین تھا کہ وہ انگریز بنا تھا۔

"کون جیتا تھا؟" اُس نے پوچھا۔

"ہم جیتے تھے۔ مگر مسلمانوں نے بھی بڑی بہادری دکھائی تھی۔ بڑی زبردست کہانی تھی۔ لاکھوں روپے خرچ ہوئے تھے۔ اس زمانے کے لاکھوں آج کل کے کروڑوں کے برابر ہیں۔ پانی کی طرح روپیہ بہایا گیا تھا۔ ہمارے لباس ولایت سے بن کر آئے تھے۔ ایک سو بیس گھوڑے خریدے گئے تھے، جو بعد میں بیچ دیے گئے۔ مگر ایک سے ایک بہترین گھوڑا تھا۔ ہر ایک گھوڑے کا ایک ایک سائیس مقرر تھا۔ جو سفید میرے پاس تھا ایسا اصیل جانور میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ پہلے دن میں نے اس کے اُوپر ران رکھی تو ایسے اُس نے مجھے اُٹھایا جیسے بچپن سے میرا پالا ہوا ہو۔ ایک مہینہ وہ میرے پاس رہا اور مہینہ بھر کسی اور نے اس کی پیٹھ پہ ہاتھ نہیں رکھا۔ تیس دن تک ——" شیخ عمر دراز نے رُک کر اپنی بات کا مزا لیا، "تیس دن تک میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُس کا واحد مالک تھا۔"

آفتاب کا دماغ اب بھٹکنے سے رُک گیا تھا۔ اب وہ اپنے ذہن کی آنکھ سے اس سارے منظر کا تصوّر کر رہا تھا۔

"بندوقوں سے لڑائی ہوئی تھی؟" اُس نے بیتابی سے پُوچھا۔

"پہلے بندوقوں سے۔ پھر جب دشمن آمنے سامنے آگئے تو ہم نے بندوقیں پھینک کر تلواریں کھینچ لیں۔"

آفتاب کو خبر بھی نہ ہوئی تھی کہ کب وہ باپ بیٹا چلتے چلتے ٹھہر گئے تھے۔ صحرا کا اور پہاڑیوں کا اور گھڑسوار انگریزوں اور بہادر مسلمانوں کے درمیان گھمسان کی جنگ کا تصوّر کرتے کرتے بے اختیار اُس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کھمچی کو اپنے سامنے اُٹھا کر دوبارہ تلوار کی مانند پھُرتی سے ہوا میں جنبش دی۔ شیخ عمر دراز نے ہاتھ بڑھا کر شیشم کی کھمچی اپنے بیٹے کے ہاتھ سے اُچک لی۔ آفتاب نے چہرہ اُٹھا کر اپنے باپ کی جانب دیکھا۔ اب آسمان کی چمک اُس کی نظر کے آگے کچھ بھی نہ تھی۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس کے باپ کا تمتماتا ہوا، تیکھے نقوش والا چہرہ تھا جس کا رنگ اب بدل چکا تھا، جیسے کہ شیشم کی پتلی سی چھڑی اُس کے ہاتھ میں آتے ہی تیز دھار تلوار بن گئی ہو جس کی نوک نے اس ہوا کی سی جھلّی کو پھاڑ کے رکھ دیا ہو جس نے اُس کے باپ اور اس کے درمیان ایک فاصلہ ڈال رکھا تھا۔

وہ ایک پست قد ٹنڈ مُنڈ درخت کے قریب کھڑے تھے جس کی چند موٹی موٹی سیاہ شاخیں ہوا میں اِدھر اُدھر پھیلی تھیں کیکر کا یہ درخت کیڑا لگنے سے سُوکھ چکا تھا۔

"سمجھو کہ جیسے یہ گھوڑا ہے۔" اُس کا باپ چھلانگ لگا کر ایک شاخ کے اُوپر سوار ہو گیا۔ اُس نے اپنا بایاں ہاتھ ہوا میں اُٹھا کر گھوڑے کی خیالی باگوں کو تھاما، اور دوسرے ہاتھ سے اپنے سامنے اور دائیں اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بائیں تیزی سے تلوار چلانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی تُندی اور چمک تھی، گویا وہ میدانِ جنگ میں گھرا دُشمن سپاہیوں کو مار مار کے گرا رہا ہو۔

"اب میرا گھوڑا زخمی ہو کر گر جاتا ہے۔" اُس کا باپ چیخا، اور چھلانگ لگا کر زمین پر آ رہا۔ مگر اُس کی چرکسی اور بازوؤں کی حرکت میں کوئی روک نہ آئی۔

اب یہ ایک عجیب منظر تھا۔ چلچلاتی ہوئی دوپہر میں ایک مُنڈے ہوئے خشک کھیت کے بیچ جھالر والا ٹوپ لگائے ایک شخص، بازو اور ٹانگیں پھیلائے انتہائی تندی سے ٹاپ ٹاپ کر ہوا میں ایک پتلی سی چھڑی چلائے جا رہا تھا اور خشک مٹی اس کے پاؤں میں گرد بن کر اُٹھ رہی تھی۔ دو کھیت پرے ایک بھینس کو ہانکتے ہوئے چند سیاہ بدن بچے رک کر اس تماشے کو دیکھنے لگے تھے۔ مگر اُس ایک بچے کے واسطے، جو اُس شخص کے پاس کھڑا تھا، اس منظر میں کوئی تضحیک نہ تھی۔ وہ بچہ اپنے آپ سے بے خبر، انہماک اور تعجّب کے ساتھ اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا جو اب اپنے دم توڑتے ہوئے گھوڑے کے پاس کھڑا ایک ایک سیکنڈ پہ دائیں، اور پھر بائیں، اور آگے اور پیچھے جھپٹ جھپٹ کر چابک دستی سے اپنی چمکتی ہوئی تیز دھار تلوار سے دشمن کے سپاہیوں کو ڈھیر کرتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دفعتاً ایک حیوانی تیزی اور بدن میں پھُرتی آ گئی تھی، اور تلوار کے وار ہوا میں شائیں شائیں کر رہے تھے۔ آفتاب کا تولیہ سر سے ڈھلک کر کندھے پر لٹک رہا تھا۔ اس لمحے میں نہ آسمان کی چمک اُس کی آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی نہ دُھوپ کی تباہ کن گرمی اُس کے بدن کو لگ رہی تھی۔ یہ لمحہ ایک خالص انسانی اور حیوانی جذبے کے امتزاج کا ایسا لمحہ تھا جس کے اندر ایک بچہ ایک آدمی میں — کوئی بھی بچہ کسی آدمی میں، خواہ وہ اس کے بیج سے ہو یا نہ ہو مگر جو اُسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے باپ کی پہچان کرتا ہے۔ جتنی تیزی سے یہ لمحے آئے تھے اتنی تیزی سے گزر بھی گئے۔

شیخ عمر دراز نے اچانک رُک کر پتلی شاخ کی چھڑی اپنے بیٹے کے ہاتھ میں پکڑائی اور ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ان کے چہرے پر پسینے کے قطرے بہہ رہے تھے۔ انہوں نے ایک ہاتھ سے ٹوپ اُٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے رومال کے ساتھ پسینہ پونچھا، پھر احتیاط سے رومال اپنی جگہ پر رکھ کر ٹوپ اُوپر جمالیا اور چل پڑے۔ آفتاب کے ہاتھ میں شیشم کی وہ پتلی سی شاخ اب محض ایک کھچی بن کر رہ گئی تھی جس کا باریک سا سرا بھی ٹوٹ گیا تھا۔ مگر اُس دس سالہ بچے نے چند لمحوں میں ایک ایسی خوشنما اور وسیع و عریض دُنیا کی جھلک دیکھ لی تھی جہاں دن آگ کی طرح دہکتا نہ تھا اور نہ رات کو سانس رُکتی تھی۔ اس کا دل ایک پرند کی مانند تھا اور اُڑ رہا تھا۔

دس ایکڑ چاہی زمین کے رقبے میں ایک جانب کنواں تھا جو گھنے درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ آفتاب نے پیارے درخت گن رکھے تھے اور گو اُسے علم تھا کہ درخت اتنی تیزی سے نہیں اُگتے کہ چند روز میں ان کی تعداد بدل جائے، مگر پھر بھی وہ ہر بار ایک ایک درخت کو گنا کرتا تھا۔ اٹھارہ دھریک کے، چار بڑے شریں، ایک جامن کا اور دو ٹاہلی کے درخت تھے۔ دُھوپ ان درختوں کے نیچے زمین تک نہ پہنچ پاتی تھی۔ ان کے سائے میں کھاٹ پر بیٹھ کر ان دونوں نے نمک والی لسّی کے کٹورے پیے۔ پھر آفتاب اُٹھ کر درخت گننے لگا۔ وہ ایک ایک درخت کے پاس جا کر اُس کے تنے کو چھُوتا اور آگے بڑھ جاتا۔ عموماً وہ ایک درخت کے دائیں طرف سے اور دوسرے کے بائیں سے ہو کر نکلتا جیسے کہ اُس کا راستہ سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا چلتا۔ اس طور پہ درختوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے بیچ چلنے میں اُس کو مزا آتا تھا۔ بعض اوقات وہ آخری درخت پہ پہنچ کر مُڑتا اور اُسی طرح ایک ایک درخت کو ہاتھ لگاتا ہوا واپس پہلے درخت پر پہنچ جاتا، مگر گنتی کو نہ توڑتا۔ پھر پہلے درخت پہ پہنچ کر پچاس کو دو سے تقسیم کر دیتا۔ اس سے اسے احساس ہوتا کہ اس کا چکر مکمل ہو گیا ہے اور حساب دُرست ہے۔ ایسا کرنے سے اس کو یہ بھی تسلّی ہو جاتی کہ درخت سارے اب محفوظ ہو گئے ہیں اور اسی طرح ہرے بھرے رہیں گے۔ کاشت کار حقہ ہاتھ میں لیے اپنے کچے کوٹھے سے نکل کر کھاٹ کے پاس زمین پر آ بیٹھا تھا اور فصلوں کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ شیخ عمر دراز کا چہرہ اب معمول پہ آ گیا تھا۔ وہ کھاٹ پہ سیدھے لیٹے تھے اور دونوں ہاتھ باندھ کر سر کے نیچے رکھے اوپر درخت کے اندر دیکھ رہے تھے۔ ان کے جواب دینے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ حسب معمول وہ کاشتکار کی بات کچھ سُن رہے ہیں کچھ نہیں سُن رہے۔ مگر کاشت کار اس کا عادی ہو چکا تھا، چنانچہ وہ اپنی باتیں کیے جا رہا تھا۔ اپنے باپ کے چہرے پر وہ نیم مگن اور پُرسکون جھلک دیکھ کر آفتاب کو اپنے دل میں مضبوطی اور اُنس کا احساس ہوا، جیسے کوئی راز وہاں پنہاں ہو گیا ہو۔ وہ گھٹنے زمین پہ اور کہنیاں کنوئیں کی موٹی اور پست دیوار پہ رکھے کنوئیں کے اُوپہ جھکا دور نیچے پانی کی سفید تھالی میں اپنے سر کا عکس دیکھتا رہا۔ پانی کی سطح پر دھریک کے زرد پتّے تیر رہے تھے اور آفتاب کے نتھنوں میں کنوئیں کی مخصوص گیلی گیلی خُنک اور کہنہ بُو چڑھ رہی تھی۔ یہ بُو ایک ایسی بُو تھی جو کسی اور شے سے نہیں آتی تھی اور اس میں کسی گئے گزرے ہوئے وقت کا احساس تھا۔ یہ کنوآں اس کے دادا نے بنایا تھا۔ وہ مختلف قسم کی موٹی اور پتلی پتلی آوازیں نکال کر کنوئیں کے اندر اُن کی گہری اور ملفوف بازگشت کو سُنتا رہا، گویا زمین کے اندر سے اس کھوئے ہوئے وقت کو پکار کر نکال رہا ہو۔ جب کنوآں چل رہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوتا تو وہ ہمیشہ گاڈھی پر بیٹھ کر بیلوں کو چلایا کرتا تھا حتیٰ کہ اس کا سر چکر کھانے لگتا۔ آج بیل سائے میں خاموش کھڑے چارہ کھا رہے تھے۔ وہ کنوئیں سے اُٹھ کر بیلوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ کنوئیں کی ٹھنڈک پہنچانے والی خوشبو، جس کو وہ اپنے دادا کی شکل سے منسوب کرتا تھا، ابھی تک اُس کے بدن میں موجود تھی۔ اُس کے بدن میں اپنے باپ کی ایک پوشیدہ شکل بھی تھی جو پھیلتی جا رہی تھی، جیسے روشنائی کا ایک ننھا سا قطرہ سیاہی چوس پر ٹپک پڑا ہو۔ پہلی بار اُس بچے کے اندر، جو ابھی مشکل سے دس برس کا ہوا تھا، پشتوں کے وقت کی گزران ہوئی تھی اور اُس کے دل میں سیرگی کی کیفیت تھی۔ اُس کی نظر ایک پلّے پر پڑی جو پیچھے سے نکل کر اس کی ٹانگوں کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ پلّا سنہری رنگ کا تھا اور اتنا چھوٹا تھا کہ کھڑا کھڑا لڑکھڑا رہا تھا۔ آفتاب اسے اُٹھانے کو جھکا تو پلّا ننھی سی چیخ مار کر ہٹا اور پھر گرتی ہوئی چال سے کوٹھے کی دیوار کے عقب میں غائب ہو گیا۔ آفتاب اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ جیسے ہی وہ دیوار کے عقب میں پہنچا اُس نے دیکھا کہ سامنے ایک گڑھے کے اندر مزارعوں کی کُتیا پلوّں کو لیے لیٹی تھی۔ کتیا آفتاب کو پہچانتی تھی چنانچہ اُس نے فقط ایک بار کان کھڑے کر کے بچے کو دیکھا اور آرام سے اپنے بڑے بڑے لٹکتے ہوئے تھن لیے لیٹی پلّوں کو دودھ پلاتی رہی۔ آفتاب نے پچھلے ہفتے کُتیا کا لٹکتا ہوا پیٹ دیکھا تھا مگر اُسے خیال بھی نہیں تھا کہ وہ بچے دینے والی ہے۔ وہ کُتیا کے گڑھے کے پاس پاؤں کے بل بیٹھ گیا اور مسخر آنکھوں سے پلّوں کو دیکھنے لگا۔ چار پلّے نظر آ رہے تھے۔ تین کالے اور سفید رنگ کے تھے جو آنکھیں میچے تھنوں پہ منہ مار رہے تھے۔ چوتھا سنہرے رنگ کا تھا جو گڑھے سے باہر گھوم پھر کر واپس آیا تھا اور سب سے زیادہ ہوشیار معلوم ہوتا تھا۔ یہ پلّا اب تھنوں کو چھوڑ کر اپنی ماں کے پیٹ پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مزارعے کے نوجوان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیٹے نے آفتاب کا اشتیاق دیکھ کر سُنہری پلّا اٹھایا اور بچے کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ پلّا چھوٹی چھوٹی چیخیں مارنے لگا۔ کتیا سر اُٹھا کر ہلکا سا غرّائی، پھر خاموش ہو رہی۔ آفتاب پلّے کو سینے سے لگائے اپنے باپ کے پاس لے آیا۔

"بابا۔ اسے گھر لے جاؤں؟" آفتاب نے باپ سے پوچھا۔

شیخ عمر دراز نے اَدھ کھلی آنکھوں سے چیختے ہوئے پلّے کو دیکھا، پھر بولے:

"دُودھ پیتا ہے — بعد میں لے جانا۔"

آفتاب پلّے کو اُٹھائے اُٹھائے واپس چلا آیا۔ کھاٹ پہ شیخ عمر دراز دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے رکھے کچھ دیر کو سو گئے۔ مزارعہ زمین پر بیٹھا حقّہ گڑگڑاتا ہوا باتیں کرتا رہا۔ آفتاب پلّوں کے گڑھے کے پاس دیوار کے سایے میں پاؤں کے بل بیٹھا، گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے اور ہاتھوں پہ ٹھوڑی جمائے سُنہری پلّے کو دیکھتا رہا۔

واپسی پر آفتاب کے دل میں کئی خیال آئے۔ اُسے خیال آیا کہ بابا سے کہے اُنہوں نے عصر کی نماز نہیں پڑھی۔ مگر یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ شیخ عمر دراز کی جب مرضی ہوتی نماز پڑھتے جب نہ ہوتی مگن رہتے۔ عجیب بات تھی کہ جب وہ نماز کو قضا کر جاتے تو نماز کے ضائع ہونے کا احساس نہ ہوتا۔ برعکس اماں کے کہ جب وہ نماز قضا کرتیں تو سب کو پتا چل جاتا کہ ان کی نماز چھوٹ گئی ہے۔ بہت بعد میں، جب وہ بڑا ہوا تو اُسے اس بات کی سمجھ آئی کہ نماز کی کیفیت دراصل مگن ہونے کی کیفیت ہوتی ہے۔ سورج ڈھل رہا تھا۔ دُھوپ کی تیزی جاتی رہی تھی۔ وہ چارے کے سبز کھیتوں کے پاس سے گزرتے تو دفعتاً ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آتا۔ کئی بار آفتاب کو خیال آیا کہ وہ پوچھے اُس فلم میں میمیں بھی تھیں؟ مگر اس بات پر مُنہ کھولنے کی اُس کی ہمّت نہ ہوئی۔ اُس کے دل میں ایک اَن ٹوٹ احساس تھا کہ یہ بات اب ایک راز بن کر ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی ہے، جس کا صرف اُسی کو علم ہے، اور اگر اُس نے دوبارہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کبھی اس بات کو چھیڑا تو اس میں فرق آجائے گا۔ اُس نے کئی بار اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ اُس کے باپ کا چہرہ اُسی طرح ٹھہرا ہوا پُرسکون اور مانوس تھا۔ جب تک وہ دونوں کھُلی جگہوں میں درختوں کے نیچے نیچے چلتے رہے اُنہیں گرمی کا احساس نہ ہوا۔ مگر جیسے ہی وہ شہر کی حدود میں داخل ہوئے تپش اور گرد و غبار نے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔ شہر میں حرکت آگئی تھی۔ لوگ اپنے گھروں سے نکل آئے تھے۔ گلیوں میں اور دکانوں پر تازہ تازہ نہائے اور بال سنوارے ہوئے لوگ ململ کے کرتے پہنے چل پھر رہے تھے۔ سرکلر روڈ پر تانگے دوڑے جا رہے تھے۔ ایک پُرانی مسافر بس دُھول اُڑاتی ہوئی گزر گئی۔ چند سائیکل سوار بس کے آگے تتر بتر ہو گئے۔ تپتی ہوئی گرد کے ذرّے آفتاب کے جسم کو چبھ رہے تھے۔ ایک جگہ پر ایک ماشکی سڑک کے کنارے تر کاؤ کر رہا تھا۔ شیخ عمر دراز نے ریڑھی سے اپنے بیٹے کو ایک قلفی خرید کر دی۔

"کتوں کو تمہاری اماں پسند نہیں کرتیں۔" وہ نرمی سے بولے، "تمہیں پتا ہی ہے۔ وہ انہیں ناپاک سمجھتی ہیں۔ تم پلّے کا ذکر نہ کرنا۔ میں بات کروں گا۔ چلو چوہدری نذیر سے ملتے ہوتے جاتے ہیں۔" وہ گھر کا راستہ چھوڑ کر ایک دوسری گلی میں مُڑ گئے۔

چودھری نذیر، جو شیخ عمر دراز کے بچپن کے دوست تھے، بنیان اور سفید چادر باندھے ہوئے گھر سے نکلے۔ آفتاب کو ان سے ہمیشہ ڈر لگتا رہتا تھا کیوں کہ وہ ہائی سکول میں سیکنڈ ہیڈ ماسٹر تھے اور بچوں کے ساتھ نہایت سنجیدگی سے بات کرتے تھے۔ مگر شیخ عمر دراز کے ساتھ، جنہیں وہ کبھی شیخ جی اور کبھی عمر کہہ کر بُلاتے تھے، خوب ہنس ہنس کر اور کبھی کبھی ہاتھ پہ ہاتھ مار کر باتیں کرتے تھے۔ چوہدری نذیر نے ان دونوں کو بیٹھک میں بٹھایا اور برف والا شربت پلایا۔ پھر وہ چھت والے پنکھے کی ڈوری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہاتھ میں لے کر زور زور سے اُسے کھینچنے اور اپنا کالا سا عینک والا چہرہ آگے بڑھا کر رازداری سے مگر اونچی آواز میں باتیں کرنے لگے۔ ان کا یہ لہجہ صرف شیخ عمر دراز کے لیے مخصوص تھا۔ آفتاب نے اپنے باپ کو چوہدری نذیر کے ساتھ سب سے زیادہ باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ کبھی کبھی وہ کھل کر ہنس بھی پڑتے تھے۔ آفتاب کا دل اب گھبرانے لگا تھا۔ ٹھنڈے شربت کا گلاس پیتے ہی بند کمرے میں بیٹھے بیٹھے اس کے سارے جسم سے پسینہ بہنے لگا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھاگ کر گھر پہنچ جائے اور سارے کپڑے اُتار کر نلکے کے نیچے بیٹھ جائے۔

"فائیل کا نمبر لکھ لو۔" اُس کے باپ نے چوہدری نذیر سے کہا، "شاید پھر میرے ذہن سے نکل جائے۔"

چوہدری نذیر نے حیرت سے اُس کے باپ کو دیکھا۔ "عمر۔ تم تو زندگی میں کبھی کوئی بات نہیں بھولے۔ میری فائیل کا نمبر بھول جاؤ گے؟"

شیخ عمر دراز آہستہ سے ہنسے۔ "پھر بھی۔" وہ بولے، "تلاش کرنے میں آسانی رہتی ہے۔"

چوہدری نذیر اچانک خاموش ہو کر شیخ عمر دراز کے چہرے کو دیکھنے لگے۔ شیخ عمر دراز نے چوہدری نذیر کو اس طرح دیکھتے ہوئے پا کر منہ پھیر لیا اور کھلے دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔ چوہدری نذیر نے ہاتھ بڑھا کر اپنے دوست کے ہاتھ پر رکھا اور تفکر سے بولے:

"عمر۔ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟"

"ہاں۔" شیخ عمر دراز ہنسے، "بالکل ٹھیک ہے۔"

گرمی آفتاب کے بدن کو کھائے جا رہی تھی۔ اُسے چوہدری نذیر پر اب غصہ آ رہا تھا کہ وہ خواہ مخواہ اُس کے باپ سے باتیں کیے جاتے ہیں اور حال پوچھے جا رہے ہیں۔ آخر جب وہ وہاں سے اُٹھ کر اپنے گھر کو چلے تو

اُس کا دل اور بھی گھبرانے لگ پڑا، جیسے کہ چوہدری نذیر کا ڈر اُس کے دل میں راہ پا گیا ہو اور دوسرے چھوٹے بڑے ڈر پیدا کر رہا ہو۔ اب اُس کا جی کر رہا تھا کہ وہ گھر نہ جائے۔ اماں اس وقت نماز کی چوکی پر بیٹھی ہوں گی۔ اُس نے خیال کیا، بیدی گھڑے بھر رہی ہو گی —— اس خیال سے بھی اُس کا دل نہ ٹھہرا۔ اُسے اپنی ماں کا خیال آئے جا رہا تھا۔ تمہارے ابّا، وہ کہا کرتی تھیں، اگر جوانی میں وقت ضائع نہ کرتے تو اس وقت مجسٹریٹ ہوتے۔ پھر وہ کہتی تھیں، ان کا دماغ اچھّا ہے، مگر دھیان نہیں دیتے۔ زمین سے ایک پیسہ نہیں آتا، سب مزارعے کھا جاتے ہیں —— اُس کی اماں بڑی حلیم طبع عورت تھیں۔ اُسے اپنی اماں سے بے حد پیار تھا۔ مگر اس وقت ان گلیوں کی گرمی اُس کا دل پیس رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اور اُس کا باپ دونوں واپس شہر سے باہر نکل جائیں، باہر درختوں کے نیچے چلتے چلتے وہ چارے کے کھیتوں تک پہنچیں اور پھر وہاں سے کنوئیں کی طرف چلے جائیں۔ ایک بار اس کا جی بڑے زور سے چاہا کہ وہ پوچھے، بابا آپ بمبئی سے چلے کیوں آئے تھے؟ اُس نے منہ اُٹھایا مگر اپنے باپ کے چہرے پر ٹھہری ہوئی متانت کو دیکھ کر خاموش رہا۔ گھر کے اندر ہو بہو وہی سماں تھا جس کا خیال آفتاب نے کیا تھا۔ چھوٹے سے پکّے صحن میں اماں نماز کی چوکی پر بیٹھی تسبیح رول رہی تھیں اور ہولے ہولے ہلتی جاتی تھیں۔ بیدی نے صحن میں ترکاؤ کر دیا تھا جس سے بھیگی ہوئی گرم اینٹوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ اب وہ نلکے پر گھڑے بھر رہی تھی۔ آفتاب اندر داخل ہوتے ہی سیدھا جا کر اپنی ماں کے پاس چوکی پر بیٹھ گیا۔ اس کی ماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنے ساتھ لگایا۔ شیخ عمر دراز نے صحن میں قدم رکھ کر السّلام علیکم کہا۔ یہ ان کا اصول تھا۔ وہ جتنی بار گھر میں آتے السّلام علیکم کہتے۔ ان کی بیوی نے ایک سرسری نظر ان پر ڈالی اور سر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی ہلکی سی جنبش سے جواب دیا۔ وہ تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ شیخ عمر دراز چند سیکنڈ تک صحن کے وسط میں کھڑے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ پھر خاموشی سے بیٹھک میں چلے گئے۔

اُن کے جاتے ہی آفتاب نے اُٹھ کر ایک ایک کر کے سارے کپڑے اُتار پھینکے اور نلکے کے نیچے جا بیٹھا۔ ٹھنڈے یخ پانی کی دھار بدن پر پڑی تو وہ ہلکی چیخیں مارنے اور جھرجھرانے لگا۔ لڑکی اس کی مزے کی چیخیں سُن کر ہنستی اور نلکا چلاتی جا رہی تھی۔ ایک آدھ منٹ میں اُس کی جھرجھری ختم ہو گئی۔ اُس نے اپنا سر گیلا کیا، پھر منہ اُٹھا کر پانی کی دھار کے آگے رکھا اور چند گھونٹ ٹھنڈے پانی کے پیے جس سے اُسے ہلکا اچھّو لگا۔ اس نے سر نیہوڑا کر دھار کے نیچے رکھ دیا اور آنکھیں بند کر کے سارے بدن پر بہتے ہوئے ٹھنڈے یخ پانی کا مزا لینے لگا۔ اس کے دل کی گھبراہٹ اب ختم ہو چکی تھی۔ اُسے بھوک لگ رہی تھی۔ اُسے پتا تھا کہ جب وہ بدن خشک کر کے کپڑے پہن لے گا تو اماں اٹھ کر روٹیاں پکائیں گی۔ پھر وہ صحن میں بیٹھ کر سب کھانا کھائیں گے۔ اب وہ خوش تھا۔

بیٹھک میں اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ شیخ عمر دراز شام کو دروازہ اور سب کھڑکیاں کھول دیتے تھے۔ آج وہ بند کمرے میں بید کی آرام کرسی پر بیٹھے تھے۔ آج انہوں نے کوئی کام حسبِ معمول نہ کیا تھا، نہ ہیٹ اُتار کر میز پر رکھا نہ بوٹ اتارے، نہ ہی کونے میں میز پر پڑا ہوا بجلی کا پنکھا چلایا۔ پسینے کے قطرے اُن کے ہیٹ کی جھالر کے نیچے سے نکل کر ماتھے پر بہہ رہے تھے اور ابرو پہ اٹکے تھے۔ کئی منٹ تک وہ اسی طرح خاموش بیٹھے رہے، جیسے گرمی میں چل چل کر تھک گئے ہوں۔ پھر جیسے اچانک کوئی بات یاد آجائے، انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا ہیٹ سر سے اُٹھایا اور احتیاط سے اُسے میز پر رکھ دیا۔ کپڑے سے سر اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماتھے کا پسینہ پونچھا اور کپڑا کرسی کے بازو پر لٹکا دیا۔ پھر جھک کر بوٹ اُتارنے کی بجائے وہ کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اندر والے دروازے کے پاس جا کر اُنہوں نے دروازہ بھیڑا اور نہایت آہستگی سے چٹخنی چڑھا دی۔ پھر کپڑوں والی الماری کھول کر انہوں نے اندر سے اپنی دو نالی بندوق نکالی اور اُس میں دو کارتوس بھرے۔ کارتوس بھر کر انہوں نے بندوق کا دستہ زمین پر ٹکایا اور جھک کر کان نالیوں کے گول سیاہ سوراخوں سے لگا دیا، جیسے کوئی آواز سُننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر اُنہوں نے بازو لمبا کر کے انگلیاں لبلبی میں داخل کیں اور ایک زوردار جھٹکے سے دونوں لبلبیاں دبا دیں۔

بیس جُون ۱۹۷۰

دوپہر سے ذرا پہلے شہر کے ریلوے سٹیشن پر ایک لمبے قد کا اجنبی گاڑی سے اُترا۔ اُس کے ہمراہ ایک نو دس سال کا بچہ تھا۔ بچے کی شکل اور چال ڈھال اُس سے مشابہت رکھتی تھی۔ یہ دونوں باپ بیٹا تھے۔ اس شخص کا نام آفتاب عمر تھا اور وہ لاہور کا ایک وکیل تھا۔ وہ صرف ایک مقصد لے کر اس شہر میں آیا تھا۔

سورج سر پر چمک رہا تھا اور ہوا پلیٹ فارم کی دہکتی ہوئی اینٹوں سے ٹکرا کر آگ بنتی جاتی تھی۔ آفتاب عمر نے دُھوپ سے بچنے کے لیے چھاتا کھولا اور اپنے آپ کو اور اپنے بیٹے کو اُس کے سائے میں رکھنے کی کوشش کرتا ہوا تیز تیز پلیٹ فارم کی لمبائی کو طے کرنے لگا۔ پلیٹ فارم کے برآمدے میں پہنچ کر وہ ٹھہر گیا۔ اُس نے اپنا اٹیچی کیس ایک ریلوے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے مسافر بنچ پر رکھا اور پتلون کی جیب سے رومال نکال کر چہرے اور گردن کا پسینہ خشک کیا۔ پھر اُس نے اُسی رومال کے ساتھ اپنے بیٹے کا پسینہ پونچھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ بچے نے ایک جنبش سے پیچھے ہٹا لیا اور اپنا رومال نکال کر اُس کے ساتھ پسینہ خشک کرنے لگا۔ دونوں نے اپنے اپنے رومال پھیلا کر ان پر پسینے اور گرد کی سیاہ لکیروں کو دیکھا اور رومال جیب میں ڈال لیے۔ آفتاب نے دُھوپ کی تیزی کے سامنے آنکھیں سکیڑ کر ایک نظر طویل پلیٹ فارم پر ڈالی۔

"جب میں یہاں سے گیا تھا،" وہ اپنے بیٹے سے بولا، "یہ پلیٹ فارم یہاں نہیں تھا۔"

"گاڑی کھڑی نہیں ہوتی تھی؟" بچے نے پُوچھا۔

"ہوتی تھی۔ سٹیشن تھا مگر پلیٹ فارم نہیں تھا۔"

"گاڑی کہاں کھڑی ہوتی تھی؟"

"زمین پر۔"

بچہ حیرت سے پلیٹ فارم کو دیکھنے لگا۔ "پلیٹ فارم کب بنا تھا؟" اُس نے پوچھا۔

"کچھ سال ہوئے۔"

"آپ نے پہلے نہیں دیکھا؟"

"نہیں۔"

بیس سال پہلے ریلوے سٹیشن کے باہر صرف ایک پیپل کا درخت تھا، باقی دُھوپ تھی اور کچی زمین۔ اب سٹیشن کی عمارت کے سامنے کی وسیع جگہ پکی تھی اور چاروں طرف بڑے بڑے شیشم کے درختوں کا گھیرا تھا۔ درختوں کے سایے میں تانگے ہی تانگے کھڑے تھے اور زمین شیشم کے پیلے پیلے بُورے والے پھُولوں سے ڈھکی تھی۔ ایک طرف کاروں کے لیے جگہ مخصوص

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی جہاں سات آٹھ پرائیویٹ کاریں آکر ٹھہری ہوئی تھیں۔ ایک کے سوا باقی سب کاروں میں سامان رکھا جا رہا تھا۔ سفر سے آنے والے اور اُن کے استقبالی کھڑے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور اخباروں رسالوں سے پنکھا کر رہے جا رہے تھے۔ کاروں کے ساتھ سکوٹروں اور سائیکلوں کا سٹینڈ تھا۔ سٹیشن کا نقشہ بدل چکا تھا۔

"آؤ باؤ جی —— آپ کا ٹانگہ۔"

"میاں صاحب اِدھر آؤ۔ سالم ٹانگہ چاہیے؟"

"باؤ صاحب تیار کھڑا ہے۔"

"جا اوئے۔ میاں صاب کو سالم ٹانگہ چاہیے۔ آؤ جی اِدھر۔ سامان دے دو۔"

آفتاب نے تانگے والوں کے جمگھٹے میں ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھا، مگر کسی کو پہچان نہ پایا۔

"کسی اچھے ہوٹل میں لے چلو۔" تانگے میں بیٹھ کر اُس نے کہا۔

"ریواز ہوٹل بہترین ہے جی۔ صاف ستھرا ہے۔ کچہری سے قریب ہے۔ گلنار بھی اچھا ہے مگر بدنام ہے۔ شریف آدمی کا اُدھر کوئی کام نہیں۔ میاں صاحب باہر سے آئے ہو؟"

سٹیشن کی سڑک اُسی طرح ٹوٹی پھوٹی اور کھڈے دار تھی۔ مگر سڑک کے دونوں جانب نئی دکانیں بن گئی تھیں۔ دوپہر کا وقت ہو چلا تھا اور لُو چلنی شروع ہو گئی تھی، مگر ہر طرف سر ہی سر نظر آتے تھے۔ سڑک پر کاروں، سکوٹروں، ٹانگوں اور سائیکلوں کا رش لگا تھا۔ آفتاب نے قمیض کی جیب سے کالی عینک نکال کر لگا لی اور ٹھنڈے شیشوں کے پیچھے آنکھوں پر زور دے کر ہر گزرنے والے کو دیکھنے لگا۔ بیس منٹ کے سفر میں اُس کو ایک بھی جانا پہچانا چہرہ نظر نہ آیا۔ اُسے یقین نہیں آتا تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ اس شہر میں اُس نے اپنی زندگی کے پہلے بیس برس گزارے تھے بیس سال پہلے جب وہ یہاں سے گیا تھا تو اُس وقت کے نئے نئے ڈگری کالج سے اُس نے بی۔اے پاس کیا تھا۔ اس شہر میں اُس کے سینکڑوں جاننے والے تھے۔ وہ سب اب کہاں چلے گئے ہیں؟ اُس نے سوچا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اُس وقت کی ساری آبادی کو یک مشت اُٹھا کہ کہیں اور لے جایا گیا تھا اور اُس کی جگہ کسی اور آبادی کو لا کر یہاں لبسا دیا گیا تھا۔

ریواز ہوٹل سے وہ واقف تھا۔ مگر پُرانی، چھوٹے سائز کی بنگلہ نما بلڈنگ غائب ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ گاچنی رنگ کی چار منزلہ ڈبہ سی عمارت کھڑی تھی جس کی کھڑکیوں پر سیمنٹ کی نیلی نیلی اُبھری ہوئی پتیوں والی بیلیں بنی تھیں۔ تیسری منزل پر اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی آفتاب کی ناک میں قدیم بند جگہوں کی سیلی بُو داخل ہوئی۔ اُس نے جا کر کھڑکی کھول دی۔ کمرے ایسے رُخ پہ بنے تھے کہ اُن میں ہوا کا گزر نہ ہوتا تھا لُو کے اس موسم میں آفتاب نے فنِ تعمیر کی اس فاش غلطی پر خدا کا شکر ادا کیا۔ ہوٹل کا ملازم ایک دو بار بجلی جلا اور بجھا چکا تھا اور اب چھت والے بجلی کے پنکھے کو چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پنکھے کے ریگولیٹر پر مکھیوں کی بیٹ کے بے شمار داغ تھے اور اس کا کنکشن کچھ ڈھیلا تھا۔

"کھانا صاب؟" اُس نے پوچھا۔

"ابھی نیچے آکر کھائیں گے۔" آفتاب نے کہا، "ٹھنڈا پانی ہو گا؟"

"ابھی لایا صاب۔"

"میں تو نہانے لگا ہوں۔" آفتاب قمیض اُتارتے ہوئے اپنے بیٹے سے بولا۔

"ابو پہلے میں نہا لوں؟"

"جانگیہ پہن کر دونوں نہا لیتے ہیں۔" آفتاب نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُس نے اٹیچی کیس کھول کر تولیہ، صابن، کنگھی، پاؤڈر کا ڈبہ اور دو صاف جانگیے، ایک بڑا ایک چھوٹا، نکالے اور سب چیزوں کو ایک چھوٹے سے ڈھیر کی شکل میں بستر پر رکھ دیا۔ کمرہ ماڈرن طرز پہ آراستہ تھا۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ دو سنگل بستر الگ الگ چارپائیوں پر لگے تھے جن پر سفید چادریں بچھی تھیں۔ بیچ میں ایک میز رکھی تھی۔ غسل خانے میں ایک شاور نصب تھا مگر پانی وہاں تک نہ چڑھتا تھا، ٹونٹی سے کمزور سی دھار نکلتی تھی جس کے نیچے بالٹی اور تام چینی کا مگ پڑا تھا۔ آفتاب ایک ایک شے کو رُک رُک کر غور سے دیکھتا رہا، جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ واپس آکر بستر پہ بیٹھ گیا۔ اُس کا بیٹا جانگیہ پہنے کمرے کے بیچ میں کھڑا پنکھے کی ہوا کھا رہا تھا۔

"ابّو آپ کا گھر کدھر تھا؟" اُس کے بیٹے نے پوچھا۔

"اُدھر ــــ" آفتاب نے کمرے میں ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اب اُس میں کون رہتا ہے؟"

"پتا نہیں اب کون رہتا ہوگا۔ میں نے بیچ دیا تھا۔"

ہوٹل کا ملازم لوہے کے جگ میں برف کا پانی لے کر آیا۔ جگ کے کنڈے پر متعدد پیلے پیلے ٹانکے لگے تھے۔ باپ بیٹے نے ایک ایک گلاس ٹھنڈے پانی کا پیا اور نہانے چلے گئے۔

کھانے کے ہال کا فرش چیس کا تھا جس پر ٹپکے ہوئے کھانے کے نشان نظر آرہے تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے آگے پردے گرے ہوئے تھے مگر میزوں اور کرسیوں اور کھانے کی پلیٹوں پر اور بازوؤں اور مستقل چلتے ہوئے جبڑوں پر مکھیوں کی بھرمار اُسی طرح تھی۔ آفتاب نے نیم اندھیرے ہال میں اس طرح قدم دھرا جیسے کوئی اداکار پہلی بار کسی نامانوس سٹیج پہ پیش ہو رہا ہو۔ دروازے میں ایک لمحے کو رُک کر اُس نے چاروں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرف دیکھا، جیسے ٹھٹک گیا ہو۔ اُس لمحے میں اُس کے دل کے اندر ایک وسیع و عریض تنہائی کا عالم تھا ـــــ وہ دونوں جا کہ ایک خالی میز کے گرد آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ لاشعوری طور پر اب آفتاب کی نظر جوان چہروں کو چھوڑ کر ادھیڑ عمر چہروں پر اٹک رہی تھی، گویا ان میں اپنا عکس تلاش کر رہا ہو۔ ان چہروں میں کسی ایک کی بھی پہچان نہ کر کے اُسے مایوسی کی بجائے ایک طرح کے اطمینان کا احساس ہوا، جیسے کوئی بوجھ اس کے دل سے اُتر گیا ہو۔

"ابّو کہانی سُنائیں۔" اُس کے بیٹے نے کھانا کھاتے ہوئے اُسے اپنا وعدہ یاد دلایا۔

"ابھی نہیں۔" وہ بولا۔

"کب۔"

"جب گھومنے جائیں گے۔"

"چار بجے؟"

"ہاں۔" وہ بولا، "چار پانچ بجے۔ ذرا سورج نیچے ہو جائے۔"

کھانے کے بعد اُس کا بیٹا پنکھے کے نیچے بستر پہ لیٹا ایک کومک پڑھتا رہا۔ پھر کروٹ بدل کر سو گیا۔ آفتاب نے سونے کی کوشش کی مگر اُسے نیند نہ آئی۔ وہ اُٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ یہ شہر کا سب سے گنجان چوراہا تھا اور دن کا سب سے گنجان وقت۔ لوگ دفتروں سے واپس آ رہے تھے اور لڑکے لڑکیاں سکولوں کالجوں سے چھوٹ رہے تھے۔ ٹریفک رُکا کھڑا تھا۔ بیس تیس تانگے، کئی سکوٹر، سائیکل اور دو تین کاریں۔ ان بیس برسوں میں اس چوراہے کا نقشہ نہ بدلا تھا۔ جوتوں کی تین دکانیں جن میں ایک باٹا کی تھی، ایک درزی، دندان ساز، سٹیشنری، عینکوں کی اور پان سگریٹ والے کی دکان۔ ان دکانوں کے رنگ تک وہی تھے۔ وہی سڑکیں تھیں۔ لڑکیاں تانگوں میں بھری سکول سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

واپس آرہی تھیں۔ زیادہ تر لڑکیاں اب بے نقاب ہو گئی تھیں۔ اُس نے سُنا تھا کہ لڑکیوں کا کالج کھُل گیا ہے۔ یہ اُس کا شہر تھا۔ سکول اور کالج جاتے آتے ہوئے سالہا سال تک اس چوراہے سے اُس کا گزر ہوا تھا۔ سینکڑوں بار اس نے اور مصطفٰے نے سیاہ برقعوں والی گورنمنٹ سکول کی چلبلی لڑکیوں کا تعاقب کیا تھا۔ یہاں سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر شہر کے اندر اُس کا گھر تھا، جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ آج بھی اگر وہ ان تین منزلوں کی سیڑھیاں اُتر کر چوراہے میں جا کھڑا ہو تو آنکھیں بند کر کے اپنے گھر پہنچ سکتا تھا، یا کسی بھی سمت کو جا سکتا تھا، جیسے کہ وہ کبھی یہاں سے گیا ہی نہ ہو۔ اُس کے شہر اور اُس کے درمیان صرف پینتالیس سیڑھیوں کا فاصلہ تھا۔ بے اختیار اُس کا جی چاہا کہ وہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اُتر کر چوراہے میں جا کھڑا ہو، کالی عینک کو آنکھوں سے اُتار دے، لوگوں کو پہچان کر ان سے ہاتھ ملائے، ان سے باتیں کرے، پھر اپنے گھر کی طرف چل دے۔ یا مصطفٰے کے گھر کی طرف۔ مصطفٰے کا والد شاید ابھی زندہ ہو، اُس نے سوچا۔ ایک لحظے کو آفتاب نے کالی عینک اُتاری تو دُھوپ بُری طرح اُس کی آنکھوں کو لگی۔ اُس نے دوبارہ شیشے آنکھوں پہ چڑھا لیے۔ ٹریفک اب چھٹنے لگا تھا۔ دکانیں دوپہر کے وقفے کے لیے ایک ایک کر کے بند ہو رہی تھیں۔ ایک گھنٹے کے اندر یہ چوراہا سُنسان ہو جائے گا، اُس نے سوچا۔ اس شہر کی کوئی شے اب اُس کی ملکیت میں نہیں تھی۔ اُنیس برس کی عمر میں اُس نے بی اے پاس کیا تھا۔ لاہور سیکرٹریٹ میں اسے ملازمت مل گئی تھی۔ جب اگلے برس اُس کی اماں اچانک بیمار پڑ کے فوت ہو گئیں تو وہ سب کچھ بیچ باچ کر لاہور منتقل ہو گیا تھا۔ وہاں اُس نے شہر سے باہر ماڈل ٹاؤن میں مکان خرید لیا تھا جس میں وہ آج تک رہتا آ رہا تھا۔ اُس نے لاء کی ڈگری لے کر ملازمت چھوڑ دی تھی اور وکالت کرنے لگا تھا۔ ہر سال وہ ارادہ کرتا تھا کہ اپنے شہر جائے، اپنے دوستوں سے ملے۔ اس کے